عکسِ فریادی



نصیر ترابی

بسم الله الرحمن الرحيم

همہ قبیلۂ من عالمانِ دِین بودند
مَرا مُعلمِ عشقِ تو شاعری آموخت

سعدؔی شیرازی

عکس فریادی

نصیر ترابی

منم در آئینہ حیران و عکس فریادی
تماشا ایست کہ ہر کس بہ خود گرفتاراست

نصیر ترابی

دیوان خانہ

غزل کتاب * عکسِ فریادی

غزل کار * نصیر ترابی

جمع آوری * خواجہ رضی حیدر، سیّد جاوید حسن، ڈاکٹر خورشید عبداللہ

حروف چیں * ابرار احمد

حروف بیں * ڈاکٹر عدنان زیدی

صورت گری * اظہر عباس جعفری

سرِ ورق * اویس امین

لوح * محمد اسمٰعیل سلفی

عکاس * عاطف علیم

ناشرانہ اہتمام * ترابیہ۔ سی ۲۰؍۱۹، فیڈرل بی ایریا، کراچی

طباعتی نگرانی * شکیل عادل زادہ

طباعت گاہ * لارئیٹ ویجز، کراچی

تقویمی حوالہ * بیسویں صدی کا آخری سال۔ فروری، سن دوہزار

اشاعتی شماریہ * نمودِ اوّل

استحقاق * اس مجموعے کے تمام تصرفات راشد ترابی اور دانش ترابی کی تحویل میں ہیں۔

ترسیلی اختیار * ویلکم بک پورٹ، کراچی

قیمت * سو روپے

سُپردگی

اپنے بابا کی نگاہِ تکلم نصاب

اور

اپنی اماں کے دستِ دعا حصار

کی پناہ میں

صفِ مژگاں

عکسِ فریادی

فریادوں کے نگار خانے میں
ایک ایسا فریادی عکس ہے جو کسی
شایستہ گوشی اور بایستہ چشمی کا انتظار
کھینچ رہا ہے ـــــ نصیرؔ

○

دِیا سا دل کے خرابے میں جل رہا ہے میاں
دیئے کے گِرد کوئی عکس چل رہا ہے میاں

یہ روح رقصِ چراغاں ہے اپنے حلقے میں
یہ جسم سایہ ہے اور سایہ ڈھل رہا ہے میاں

یہ آنکھ پردہ ہے اک گردشِ تحیّر کا
یہ دل نہیں ہے بگولا اُچھل رہا ہے میاں

کبھی کسی کا گزرنا کبھی ٹھہر جانا
مِرے سکوت میں کیا کیا خلل رہا ہے میاں

کسی کی راہ میں افلاک زیرِپا ہوں گے
یہاں تو پاؤں سے صحرا نکل رہا ہے میاں

ہجومِ شوق میں یہ دل ہی بے غرض نکلا
چلو کوئی تو حریفانہ چل رہا ہے میاں

تجھے ابھی سے پڑی ہے کہ فیصلہ ہو جائے
نہ جانے کب سے یہاں وقت ٹل رہا ہے میاں

طبیعتوں ہی کے ملنے سے تھا مزہ باقی
سو وہ مزہ بھی کہاں آج کل رہا ہے میاں

بدل رہی ہے مضافاتِ گُل کی آب و ہوا
کوئی ہماری بھی خاطر بدل رہا ہے میاں

غموں کی فصل میں جس غم کو رائیگاں سمجھے
خوشی تو یہ ہے کہ وہ غم بھی پھل رہا ہے میاں

لکھا نصیرؔ نے ہر رنگ میں سپید و سیاہ
مگر جو حرف لہو میں مچل رہا ہے میاں

1989ء

○

ہم رَہی کی بات مت کر امتحاں ہو جائے گا
ہم سُبک ہو جائیں گے تجھ کو گراں ہو جائے گا

جب بہار آ کر گزر جائے گی اے سَروِ بہار
ایک رنگ اپنا بھی پیوندِ خزاں ہو جائے گا

ساعتِ ترکِ توقع بھی قریب آ ہی گئی
کیا یہ اپنا سب تعلق رائیگاں ہو جائے گا

یہ ہَوا سارے چراغوں کو اُڑا لے جائے گی
رات ڈھلنے تک یہاں سب کچھ دُھواں ہو جائے گا

اس ہوا میں اپنی راتوں سے بھی کچھ وعدے کرو
بے چراغو، آخر ایسا کیا زیاں ہو جائے گا

چشم و دل کی راہ میں کچھ بستیاں آباد ہیں
رفتہ رفتہ ایک دریا درمیاں ہو جائے گا

ایک سیلاب آرہا ہے بند باندھو ورنہ پھر
شہر والو، شہر یہ بے خانماں ہو جائے گا

دل زَدو، اِن بے شجر رَستوں کو طے کرتے رہو
کوئی ابرِ مہرباں بھی سائباں ہو جائے گا

شاخِ ویراں پھر نُموساماں ہوئی دیکھو نصیرؔ
پھر رواں اک کاروبارِ آشیاں ہو جائے گا

1975ء

○

دیکھ لیتے ہیں اب اُس بام کو آتے جاتے
یہ بھی آزار چلا جائے گا جاتے جاتے

دل کے سب نقش تھے ہاتھوں کی لکیروں جیسے
نقشِ پا ہوتے تو ممکن تھا مِٹاتے جاتے

تھی کبھی راہ جو ہم راہ گزرنے والی
اب حذر ہوتا ہے اُس راہ سے آتے جاتے

شہرِ بے مہر کبھی ہم کو بھی مہلت دیتا
اک دِیا ہم بھی کسی رُخ سے جلاتے جاتے

پارۂ ابرِ گریزاں تھے کہ موسم اپنے
دُور بھی رہتے مگر پاس بھی آتے جاتے

ہر گھڑی ایک جُدا غم ہے جُدائی اُس کی
غم کی معیاد بھی وہ لے گیا جاتے جاتے

اُس کے کوچے میں بھی ہو، راہ سے بے راہ نصیرؔ
اِتنے آئے تھے تو آواز لگاتے جاتے

1978ء

○

شبِ فراق بھی چہرہ نُما گزرتی ہے
کبھی چراغ بکف بھی ہَوا گزرتی ہے

دِلوں کی راہ میں دریا بھی آئے تھے کیا کیا
اب اِس سفر میں زمیں زیرِپا گزرتی ہے

وہ رات گھر میں پریشان و سَرگراں گزری
جو رات شہر میں نغمہ سَرا گزرتی ہے

تمام رات فضا میں وہی ہے گریۂ میرؔ
کسے خبر پسِ دیوار کیا گزرتی ہے

نہ آئی ساعتِ جاناں کہ جس کو آنا تھا
اور ایک ساعتِ جاں بارہا گزرتی ہے

کُھلا یہی کہ شکست آشنا بھی ہے کیا کیا
وہ اک نگہ جو نبرد آزما گزرتی ہے

ہم اہلِ ہجر کو صحرا ہی ایک رستہ تھا
اب اِس طرف سے بھی خلقِ خدا گزرتی ہے

کبھی یہ حال کہ مل کر بھی جی نہ بھرتا تھا
اور اب بغیرِ سلام و دعا، گزرتی ہے

رفاقتوں کا یہ موسم بھی دیکھنا تھا نصیؔر
ہماری عمر ہمی سے جُدا گزرتی ہے

1978ء

آ کہ بس اب قرار جاتا ہے
سب ترا اعتبار جاتا ہے

کون ہے یہ جو مجھ کو پچھلے پہر
روز آ کر پکار جاتا ہے

آنکھ جاتی ہے اک کنارے تک
دل سمندر کے پار جاتا ہے

شور اُٹھتا ہے رات بھر کیسا
کون یہ شہسوار جاتا ہے

کُشتگاں سے زمین سُرخ ہوئی
کہیں جی کا غبار جاتا ہے

عشق تنہا ہمی پہ سخت نہیں
کوہ کَن بھی تو ہار جاتا ہے

تشنگی وہ کہ ماہِ کنعاں بھی
چاہ میں دن گزار جاتا ہے

قصۂ نجد کو زمانہ ہُوا
دل اُدھر بار بار جاتا ہے

دل زَدوں کو سلام جن کے سبب
خوش، غمِ انتظار جاتا ہے

کیا بندھی ہے ہَوا چراغوں کی
دیکھ، خالی یہ وَار جاتا ہے

شغلِ وحشت کو شہر ترک کرے
اپنا تو روزگار جاتا ہے

اپنی آشفتگی کا سَیل نصیرؔ
از خزاں تا بہار جاتا ہے

1981ء

○

محل سَرا میں ہے کوئی نہ خیمہ گاہ میں ہے
عجیب شہر ہے سارا ہی شہر راہ میں ہے

ہَوا کے پیچ میں آئے ہیں رشتہ و پیوند
گلیم میں ہے وہ سَج دھج نہ اب کُلاہ میں ہے

اِدھر تو وقت عجب کچھ قیامتی آیا
اماَں اُسے بھی نہیں جو تری پناہ میں ہے

یہ رُخ ہواؤں کا صورت ہے کس تغیّر کی
جو تیرے دل میں ہے وہ بھی مِری نگاہ میں ہے

سخن بھی ہوتے ہیں اکثر پسِ سخن کیا کیا
ترے سکوت کا لہجہ بھی میری آہ میں ہے

شعاعِ مہر کہاں کوفۂ چراغاں میں
سیاہیوں کے سِوا کیا شبِ سیاہ میں ہے

دمشقِ عشق میں دیوار و دَر کی حسرت کیا
مسافروں کو تو رہنا ہی گردِ راہ میں ہے

چلے گا کون کہاں تک، یہ دیکھنا ہے مجھے
وفا ہے جس میں ہوَس بھی اُسی نگاہ میں ہے

کسے خبر کہ یہاں معرکہ رسائی کا
کسی سخن میں نہیں، ہے تو ایک آہ میں ہے

تمام راستے جاتے ہیں ایک منزل تک
کہیں گئے بھی تو آنا اُسی کی راہ میں ہے

یہ گردشوں کی درازی مجھی پہ ختم نہیں
ستارہ جو بھی تو دامِ شبِ سیاہ میں ہے

وہ شہ سوار ہری روشنیٔ جاں ہے، نصیرؔ
نہ جو سپاہ سے باہر نہ جو سپاہ میں ہے

1977ء

○

یہ سفر ہے حسرتوں کا اِسے ناتمام رکھنا
کبھی یارِ دل شِکن سے کبھی دل سے کام رکھنا

یونہی دُور دُور رہنا وہ ملے تو کچھ نہ کہنا
بس حرفِ بے تکلّم اُسے ہمکلام رکھنا

کسی شامِ دل دَہی سے کسی صبحِ جاں کنی تک
جو چراغ بجھ رہا ہو اُسے میرے نام رکھنا

کسی یاد کی حنا کو گلِ دستِ شب بنانا
کسی آنکھ کے دِیئے کو سرِ طاقِ شام رکھنا

یہ ہوائے بے خیالی تو ہے کام آنے والی
نہ کوئی گِلہ گزاری نہ دعا سلام رکھنا

جو زیادہ بے دِلی ہو جو فزوں شکستگی ہو
بہت انتظار کرنا، بہت اہتمام رکھنا

یہ نصیؔر طَور کیا ہے ترے دل میں اور کیا ہے
نہ حسابِ راہ کوئی نہ خیالِ بام رکھنا

1991ء

O

آئیں گے لَوٹ کر کہاں بِیتے دنوں کے کارواں
گَرد بھی ساتھ لے گئے ناقہ سوار و ساربان

خاک ہے کوئے دل بَراں خواب ہے شہرِ دوستاں
اِس کے سِوا ہے اور کیا اُجرتِ عمرِ رائیگاں

وقت ہے کوہِ خود نِگر دید و شنید بے اثر
تو ہے اُدھر تو میں اِدھر، برف جمی ہے درمیاں

خار و خسِ ملال کیا سیلِ رَم و قرار میں
چھوٹ گئے ہیں حوصلے ڈوب گئی ہیں کشتیاں

غم کی ہَوا تھی پُر تپاک، دل کی فضا تھی تاب ناک
کیا ہیں مسافتوں کے چاک، بول رہا ہے بادباں

کوئی تو حد ہو آخری تیزرَوی کی حد کوئی
اور اگر زمیں کھنچی ٹوٹ پڑے گا آسماں

موسمِ سبز پوش میں سارے شجر ہیں زَرد زَرد
جی یہی چاہتا ہے اب تجھ سے ملیں خزاں خزاں

دونوں ہَوا پسند ہیں دونوں کا اعتبار کیا
آنکھیں ہیں میری رنگ رنگ چہرہ ترا دُھواں دُھواں

دیکھ یہ شب گزیدہ لَو دیکھ مِرا پریدہ رنگ
اے مِری شمعِ ہم فراق، سوچ یہ کِس کا ہے زیاں

یاد نہ کر گھڑی گھڑی بھول بھی جا کبھی کبھی
چہرہ نُما وہ چلمنیں، چشم کُشا وہ کھڑکیاں

بادِ صبا وہ آہٹیں بادِ صبا وہ دستکیں
کچھ تو جزائے ہم رَہی ایسی بھی کیا اُداسیاں

دل سرِ شام بجھ گئے رنگ تمام بجھ گئے
سوچ رہا ہوں دیر سے، جاؤں کہیں، مگر کہاں

ابر شکن یہ چاندنی پُرزہ قبا یہ روشنی
بکھری ہوں جیسے ہر طرف خلعتِ گُل کی دھجّیاں

طاق و اُطاق بے چراغ خاک بسر خُم وایاغ
مسند و چتر کم فراغ، یخ زدہ ترکش و کماں

تکیہ کرو مسافرو سایۂ ابر و باد پر
دیکھو زمیں کو اُوڑھ کر سو بھی چکیں حویلیاں

کل بھی رہیں گی فُرصتیں کل پہ رکھو مسافتیں
آؤ نصیر گھر چلیں، رات ڈھلی کشاں کشاں

1969ء

○

تجھے کیا خبر مرے بے خبر، مرا سلسلہ کوئی اور ہے
جو مجھی کو مجھ سے بہم کرے وہ گریزپا کوئی اور ہے

مرے موسموں کے بھی طور تھے مرے برگ وبار ہی اور تھے
مگر اب روش ہے الگ کوئی مگر اب ہوا کوئی اور ہے

یہی شہر، شہرِ قرار ہے تو دلِ شکستہ کی خیر ہو
مری آس ہے کسی اور سے مجھے پوچھتا کوئی اور ہے

یہ وہ ماجرائے فراق ہے جو محبتوں پہ نہ کُھل سکا
کہ محبتوں ہی کے درمیاں سببِ جفا کوئی اور ہے

ہیں محبتوں کی امانتیں، یہی ہجرتیں یہی قربتیں
دیے بام و دَر کسی اور نے تو رہا بسا کوئی اور ہے

یہ فضا کے رنگ کُھلے کُھلے اِسی پیش و پس کے ہیں سلسلے
ابھی خوشنوا کوئی اور تھا ابھی پَرکُشا کوئی اور ہے

دلِ زُود رنج نہ کر گلہ کسی گرم و سردِ رقیب کا
رُخِ ناسزا تو ہے رُوبرو پسِ ناسزا کوئی اور ہے

بہت آئے ہمدم و چارہ گر جو نمود و نام کے ہو گئے
جو زوالِ غم کا بھی غم کرے وہ خوش آشنا کوئی اور ہے

یہ نصیرؔ شامِ سُپردگی کی اُداس اُداس سی روشنی
بکنارِ گل ذرا دیکھنا یہ تمہی ہو یا کوئی اور ہے

1977ء

○

خوش اپنا غم گُسار کبھی ہے کبھی نہیں
غم کا بھی اعتبار، کبھی ہے کبھی نہیں

حاصل کے خوب وزشت میں شامل ہے وہ نگاہ
اپنے لیے بہار کبھی ہے کبھی نہیں

دن اُس کا انتظار ہے رات اُس کا انتظار
اور پھر یہ انتظار کبھی ہے کبھی نہیں

چاکِ جگر کو سوزنِ مژگاں سے کر رفو
دامن بھی تار تار کبھی ہے کبھی نہیں

اے ہجر اپنے چاہنے والوں کی بات رکھ
ورنہ یہ روزگار کبھی ہے کبھی نہیں

لوگوں سے بے رُخی کا گلہ کس لیے نصیرؔ
تُو بھی تو میرے یار، کبھی ہے کبھی نہیں

1997ء

○

گُل ہیں کہ فروزاں ہیں دل ہے کہ بجھا چاہے
یہ موسمِ بے یاراں کیا جانئے کیا چاہے

غم خوارِ غمِ جاناں دَم سازِ دلِ ویراں
اک زخمِ تمنا تھا اب وہ بھی بھرا چاہے

اے صاحبِ اندیشہ اِس دل کی بھی شنوائی
تیری ہی گواہی میں کچھ تجھ سے کہا چاہے

اب شام سے پہلے ہی اِس شہرِ چراغاں میں
جاگا کئی راتوں کا آرام ذرا چاہے

یہ کارِ کم اسبابی اک عمر کا قصہ ہے
اِس قریۂ عجلت میں کون آ کے رہا چاہے

انبوہِ جنوں آئے اور دجلۂ خُوں گزرے
صحرا بھی نہ چاہے گا جو آبلہ پا چاہے

قصے کبھی اوَروں کے باتیں کبھی غزلوں کی
دل خوب سمجھتا ہے وہ جاننا کیا چاہے

جو کچھ بھی گزرتی ہے کہہ گزرو نصیرؔ اب تو
اِس گرم نوائی کی جو بھی ہو سزا چاہے

1979ء

○

شہر میں کس سے سخن رکھیئے، کدھر کو چلیئے
اِتنی تنہائی تو گھر میں بھی ہے، گھر کو چلیئے

اِتنا بے حال بھی ہونا کوئی اچھا تو نہیں
اب وہ کِس حال میں ہے اُس کی خبر کو چلیئے

یاں جو نقشِ کفِ پا ہے سو بساطِ جاں ہے
اک ذرا دیکھ کے اِس راہ گزر کو چلیئے

دل بھی شعلے کی طرح اپنی ہَوا میں گُم ہے
رقص کرتے ہوئے اک بار اُدھر کو چلیئے

دَر و دیوار سے راتوں کو صدا آتی ہے
صبح سے پہلے کسی اور نگر کو چلیئے

مصلحت حلقہ کُناں رہتی ہے اُس کے اطراف
کس توقع پہ وہاں اپنی بَسر کو چلیئے

پھر کسی نام کی اک شام سرِ بام آئی
دل کی یہ ضد ہے کہ بس ایک نظر کو چلیئے

ہر طرف ایک سا عالم ہے جہاں بھی رُکیے
ہر طرف ایک سی گردش ہے جدھر کو چلیئے

دل سرائے میں دِیا شام کو جلتے ہی نصیرؔ
کوئی کہتا ہے کہیں سیر و سفر کو چلیئے

1991ء

○

وہ بے وفا ہے تو کیا، مت کہو بُرا اُس کو
کہ جو ہُوا سو ہُوا خوش رکھے خدا اُس کو

نظر نہ آئے تو اُس کی تلاش میں رہنا
کہیں ملے تو پلٹ کر نہ دیکھنا اُس کو

وہ سادہ خُو تھا زمانے کے خَم سمجھتا کیا
ہَوا کے ساتھ چلا لے اُڑی ہَوا اُس کو

وہ اپنے بارے میں کتنا ہے خوش گماں دیکھو
جب اُس کو میں بھی نہ دیکھوں تو، دیکھنا اُس کو

ابھی سے جانا بھی کیا اُس کی کم خیالی پر
ابھی تو اور بہت ہوگا سوچنا اُس کو

اُسے یہ دُھن کہ مجھے کم سے کم اُداس رکھے
مِری دعا کہ خدا دے یہ حوصلہ اُس کو

پناہ ڈھونڈ رہی ہے شبِ گرفتہ دِلاں
کوئی بتاؤ مِرے گھر کا راستا اُس کو

غزل میں تذکرہ اُس کا نہ کر نصیرؔ کہ اب
بُھلا چکا وہ تجھے، تُو بھی بھول جا اُس کو

1973ء

○

ہے دِگر سب سے مِرے سَروِ سرافراز کا رنگ
وہ تو بول اُٹھتا ہے رنگوں میں اِس انداز کا رنگ

میرے موسم کا طبق میرے لہو کی گردش
تیرے الفاظ کی خوشبو، تری آواز کا رنگ

تیری آنکھوں سے نمایاں مِرے دل میں پیچاں
کسی انجام کا پَرتو، کسی آغاز کا رنگ

فصلِ آئندہ کے قصّوں میں بھی کام آئے گا
میرے پندار کا اسلوب ترے ناز کا رنگ

کون سی رُت میں فضا دل کی کُھلے گی آخر
کن ہَواؤں میں کُھلے گا مِری پرواز کا رنگ

کم سخن ہو کے بھی لبریزِ سخن ہے گویا
اب کے گہرا ہے بہت غمزۂ غماز کا رنگ

دل رُبائی میں رہی چہرۂ خاموش کی بات
خوش نُمائی میں رہا طعنۂ طنّاز کا رنگ

شب اگر ہے تو کسی توشۂ آزار کی شب
رنگ اگر ہے تو کسی خوابِ پس انداز کا رنگ

خاک اُڑاتے ہوئے جھونکے ہیں کہ سنّاٹا ہے
رقص کرتا ہوا شعلہ ہے کہ آواز کا رنگ

اُس کے جاتے ہی ہر اک آس کی لَے ٹوٹ گئی
پھر نہ وہ شمع کی لَو ٹھہری نہ وہ ساز کا رنگ

فیضؔ کے بعد کہاں کوئی نواگر کہ نصیرؔ
"حرفِ سادہ کو عنایت کرے اعجاز کا رنگ"1

1۔ فیض احمد فیض

1985ء

○

اِتنا نزدیک بھی نہ تُو ہو جائے
ختم ہی ساری ہاؤ ہُو ہو جائے

بِن کہے کب تلک کہے کوئی
آج تو کھُل کے گفتگو ہو جائے

دل کی رونق ہو آنکھ میں کیا خاک
جب یہ مِٹّی ہی بے نمو ہو جائے

دوست رُوٹھے مگر یہ دُکھ تو نہ ہو
مجھ سے بے رُخ مِرا عدُو ہو جائے

اے محبّت کوئی قدم ایسا
وہ بھی مجبورِ جستجو ہو جائے

کتنے موسم اِسی میں بِیت گئے
شاید اب کے وہ ہم سبُو ہو جائے

خواب ہی میں چھلک پڑے کوئی رنگ
کوئی شب یوں بھی سُرخرو ہو جائے

خیر مانگو، دعا کرو یہ نصیؔر
نذرِ حسرت نہ آبرو ہو جائے

1993ء

○

آخر کو وحشتوں کا سلیقہ سا ہوگیا
چلتے رہے تو راستا اپنا سا ہوگیا

تھی بے دِلی بھی راہ میں دیوار کی طرح
لہرائی اک صدا کہ دریچہ سا ہوگیا

واں اہتمامِ چہرہ نُمائی کہ دیکھنا
یاں آنکھ جب اُٹھائی تو پردہ سا ہوگیا

تھے آئینوں میں ہم تو کوئی دیکھتا نہ تھا
آئینہ کیا ہوئے کہ تماشا سا ہوگیا

گزرا تھا کب اِدھر سے اُمیدوں کا یہ ہجوم
اِتنے دِیئے جلے کہ اندھیرا سا ہو گیا

یوں دل دَہی کو دن بھی ہُوا رات بھی ہوئی
گزری کہاں ہے عمر، گزارا سا ہو گیا

یہ موسمِ مُراد کی اچھی ہَوا چلی
ایسی ہَوا کہ دل تہہ و بالا سا ہو گیا

اُٹھی رقابتوں کی عجب لہر اِن دنوں
ہر شخص تیرے شہر میں تنہا سا ہو گیا

اچّھا بہت لگا وہ ستاروں کا ٹوٹنا
رات اپنے جی کا بوجھ بھی ہلکا سا ہو گیا

ہر شام اک ملال کی عادت سی ہو گئی
ملنے کا اِنتظار بھی مِلنا سا ہو گیا

زلفِ سخن نہ تھی کوئی زنجیر تھی نصیرؔ
یہ سلسلہ بھی ہم کو مہیّا سا ہو گیا

1992ء

○

اے مِری زندگی اے مِری ہم نوا، تُو کہاں رہ گئی میں کہاں آ گیا
کچھ نہ اپنی خبر کچھ نہ تیرا پتا تُو کہاں رہ گئی میں کہاں آ گیا

جتنے چہرے چراغوں کے تھے بجھ گئے اب وہ جلسے گئے وہ قرینے گئے
اب کدھر جی لگے شامِ یاراں بتا، تُو کہاں رہ گئی میں کہاں آ گیا

دَرد میں دَرد کی سی چمک ہی نہیں وہ زمیں ہی نہیں وہ فلک ہی نہیں
بے ستارہ ہے شب اے شبِ آشنا، تُو کہاں رہ گئی میں کہاں آ گیا

دیکھنا دُور تک خاک اُڑنے لگی کس خرابے کو یہ راہ مُڑنے لگی
مجھ کو آواز دے وادیٔ جانفزا، تُو کہاں رہ گئی میں کہاں آ گیا

خَم بہ خَم راستے، درمیاں مرحلے، اک طرف بے دلی، اک طرف حوصلے
ڈھونڈتا ہوں تجھے عمرِ برگشتہ پا تُو کہاں رہ گئی میں کہاں آ گیا

سبز شاخوں سے گُل یونہی چُننا کبھی گُل سے گُلزار کے خواب بُننا کبھی
فرصتِ ابتدا حسرتِ انتہا، تُو کہاں رہ گئی میں کہاں آ گیا

کیا وہی صبح کے رنگ تصویر ہیں کیا وہی شام کے سائے زنجیر ہیں
کچھ تو معلوم ہو مجھ کو بادِ صبا، تُو کہاں رہ گئی میں کہاں آ گیا

اے مری شمعِ جاں صورتِ مہرباں اب یہ شہر گماں ہے دُھواں ہی دُھواں
تُو یقیں ہے مِرا، تُو کہیں ہے تُو آ، تو کہاں رہ گئی میں کہاں آ گیا

چھب دکھائی نہ دے دُھن سنائی نہ دے کوئی گردش سراغ رِسائی نہ دے
چشمِ نم کی دھنک رقصِ دل کی صدا، تُو کہاں رہ گئی ہے میں کہاں آ گیا

غم وہ بادل کے یک جا ٹھہرتا نہیں، دل وہ دریا کہ یک سُو گزرتا نہیں
شاد و آباد رہنے کی رسمِ دعا، تُو کہاں رہ گئی میں کہاں آ گیا

1980ء

○

بے دست و پا سوادِ حریفاں کو سَر کیا
اِس معرکے میں دل نے بھی کیا کیا جگر کیا

کس گھر تُو گوشہ گیر تھی اے فرصتِ قرار
لوگوں نے انتظار ترا عمر بھر کیا

تجھ کو اُس ایک روزِ قیامت کی کیا خبر
تو نے وہ دن سُنا ہی سُنا، یاں بسر کیا

وہ اک ہوائے خوش نگہی تھی گزر گئی
اپنی خبر نے اور مجھے بے خبر کیا

آخر شکست خوردہ ہُوا اُس کے روبرو
اک عہدِ بے رُخی جو سمجھ سوچ کر کیا

میرے سخن سے آنکھ وہ لبریز ہوگئی
اک بے نوا نے بے ہنری کو ہنر کیا

دریا تو اپنی لہر میں اک شہر لے گیا
صحرا نے خُوردبُرد وہ دریا کدھر کیا

دشتِ ہنر سَرابِ رفاقت ہُوا نصیرؔ
اُتنا ہی فاصلہ رہا جتنا سفر کیا

1980ء

○

یہ دن بھی گزرا، رہِ رائیگاں کے قصّوں میں
یقیں نہ ہو تو مزہ کیا گماں کے قصّوں میں

سمومِ تنگ دِلی نے یہ حوصلہ نہ رکھا
کہ شاخِ دل کو رکھوں آشیاں کے قصّوں میں

جو ایک بابِ دِگرگُوں سنا گئی ہے وہ آنکھ
کبھی پڑھا تھا اُسے بھی خزاں کے قصّوں میں

وہ ایک خواب کہ ہے مہرباں، شجر کی طرح
ملا وہ موسمِ نامہرباں کے قصّوں میں

خیالِ سَیل و سوالِ طناب رہتا ہے
سفر سفر نہ رہا، بادباں کے قصّوں میں

ہَوائے زلف تھی لائی فضائے مقتل تک
کہاں کے لوگ تھے، اُلجھے کہاں کے قصّوں میں

حسابِ دوری و نزدی میں یہ کُھلا آخر
کہیں بھی تو نہیں سُودوزیاں کے قصّوں میں

وہ شام آئے گی کچھ کہنے بار بار نصیؔر
لکھا ہے جس کو شبِ رفتگاں کے قصّوں میں

1985ء

○

پہلا سا حال پہلی سی وحشت نہیں رہی
شاید کہ تیرے ہجر کی عادت نہیں رہی

شہروں میں ایک شہر مرے رَت جگوں کا شہر
کوچے تو کیا دِلوں ہی میں وسعت نہیں رہی

لوگوں میں میرے لوگ وہ دل دارَیوں کے لوگ
بچھڑے تو دُور دُور رقابت نہیں رہی

شاموں میں ایک شام وہ آوارگی کی شام
اب نیم وَا دریچوں کی حسرت نہیں رہی

راتوں میں ایک رات مِرے گھر کی چاند رات
آنگن کو چاندنی کی ضرورت نہیں رہی

راہوں میں ایک راہ وہ گھر لَوٹنے کی راہ
ٹھہرے کسی جگہ وہ طبیعت نہیں رہی

یادوں میں ایک یاد کوئی دل شکن سی یاد
وہ یاد اب کہاں ہے کہ فرصت نہیں رہی

ناموں میں ایک نام سوال آشنا کا نام
اب دل پہ ایسی کوئی عبارت نہیں رہی

خوابوں میں ایک خواب تری ہم رَہی کا خواب
اب تجھ کو دیکھنے کی بھی صورت نہیں رہی

رنگوں میں ایک رنگ تری سادگی کا رنگ
ایسی ہَوا چلی کہ وہ رنگت نہیں رہی

باتوں میں ایک بات تری چاہتوں کی بات
اور اب یہ اِتّفاق کہ چاہت نہیں رہی

یاروں میں ایک یار وہ عیّاریوں کا یار
مِلنا نہیں رہا تو شکایت نہیں رہی

فصلوں میں ایک فصل وہ جاں دادگی کی فصل
بادل کو یاں زمین سے رغبت نہیں رہی

زخموں میں ایک زخم متاعِ ہنر کا زخم
اب کوئی آرزوئے جراحت نہیں رہی

سنّاٹا بولتا ہے صدا مت لگا نصیرؔ
آواز رہ گئی ہے سماعت نہیں رہی

1974ء

○

مژہ کی شاخ پہ نادیدہ برگ و بار آیا
جو ٹو گیا تو مجھے نامۂ بہار آیا

کہاں کہاں نہ گئے خستگانِ شامِ فراق
نہ وہ چراغ جلے اور نہ وہ دیار آیا

بھری بہار میں اک ساربانِ ناقۂ وقت
سوادِ رنج کشاں میں مجھے اُتار آیا

جہاں جہاں بھی تھا امکانِ بازدید کوئی
وہاں وہاں مرا سایہ اُسے پکار آیا

کُھلا کہ وعدہ وفائی کے مرحلے ہیں کئی
نہ آیا وہ تو چلو اُس کا اعتبار آیا

یہ میرے حسنِ طبیعت کی مَرحمت ہے نصیرؔ
مثالِ دوست عُدو مجھ کو سازگار آیا

1980ء

○

اب کہاں لہر کوئی کوچۂ جاناں والی
پھر ہَوا ہوگئی زنجیر بیاباں والی

لَو چراغوں کی دلآویز ہے روزن روزن
گھر کو رونق بھی میّسر ہے تو زنداں والی

دل زدہ خاک بسر پھرتے ہیں ہجراں والے
کوئی تو راہ نکل آئے گریباں والی

ابرِ باراں بھی دُھواں موجِ ہَوا بھی پیچاں
ہر طرف بات وہی زلفِ پریشاں والی

کئی رنگ آنکھوں نے رکھے ہیں پس انداز ابھی
شاید آجائے کوئی رات چراغاں والی

تھا کوئی شور ملاقات کی خوش وقتی میں
گفتگو ہو نہ سکی وعدہ و پیماں والی

دائرے گردِ مہ و سال نے کھینچے کیا کیا
صورتیں چھپ گئیں سب حلقۂ یاراں والی

اپنی وحشت میں گئے کارِ جہاں سے بھی نصیرؔ
جان کر ہار گئے شرط بھی جاناں والی

1983ء

○

وہ ہم سفر تھا مگر اُس سے ہم نوائی نہ تھی
کہ دُھوپ چھاؤں کا عالم رہا، جدائی نہ تھی

نہ اپنا رنج نہ اوروں کا دُکھ، نہ تیرا ملال
شبِ فراق کبھی ہم نے یوں گنوائی نہ تھی

محبتوں کا سفر اِس طرح بھی گزرا تھا
شکستہ دل تھے مسافر شکستہ پائی نہ تھی

عداوتیں تھیں، تغافل تھا، رنجشیں تھیں مگر
بچھڑنے والے میں سب کچھ تھا، بیوفائی نہ تھی

بچھڑتے وقت اُن آنکھوں میں تھی ہماری غزل
غزل بھی وہ جو کسی کو ابھی سُنائی نہ تھی

کبھی یہ حال کہ دونوں میں یک دِلی تھی بہت
کبھی یہ مرحلہ جیسے کہ آشنائی نہ تھی

عجیب ہوتی ہے راہِ سخن بھی دیکھ نصیؔر
وہاں بھی آگئے آخر جہاں رسائی نہ تھی

1971ء

○

کوئی راہی ہے نہ راہوں کا نشاں آہستہ چل
اب یہاں سے چل، دلِ بے خانماں آہستہ چل

یہ دیارِ تشنگاں ہے گَرد کی صورت یہاں
میں بھی تیرے ساتھ ہوں ابرِ رَواں، آہستہ چل

اِن پہاڑوں کے اُدھر بھی قربتیں ناپید ہیں
عمر بھر حائل رہے گا آسماں، آہستہ چل

ہر شجر سائے کے پہلو میں تھکن سے چُور ہے
اے ہوائے کوچۂ نامہرباں، آہستہ چل

وادیٔ گُل کے مسافر اِس قدر عجلت بھی کیا
یہ زمیں مقتل رہی ہو گی یہاں، آہستہ چل

وعدہ و پیماں کو اپنے پاؤں کی زنجیر کر
اِس رفاقت کا بھی ہو کچھ امتحاں آہستہ چل

رفتنی ہم ہی نہیں ہیں وقت بھی ہے رفتنی
ہر قدم دُوری کا ہے وہم و گماں، آہستہ چل

اُس کے کوچے میں ہَوا کی ہم رَہی درپیش تھی
وہ مسافت وہ ندامت اب کہاں، آہستہ چل

ہر پُرانی راہ سے اِتنا گریز اچھا نہیں
دل جہاں مجبور ہو جائے، وہاں آہستہ چل

دُور کی ہر روشنی منزل نہیں ہوتی نصیرؔ
دیکھ وسطِ دل تک آ پہنچا دُھواں، آہستہ چل

1968ء

○

ساری محفل سے دُور جو بیٹھے
بیٹھے بیٹھے کسی کے ہو بیٹھے

تھی کوئی آس وہ جو ساتھ رہی
تھا کوئی حال وہ جو کھو بیٹھے

کس کنارے یہ موج لے آئی
دل کی باتوں میں گھر ڈُبو بیٹھے

اُس کے جانے کی دیر تھی شاید
اپنی آنکھوں سے ہاتھ دھو بیٹھے

ہم سے اپنے دِنوں کا ذکر نہ کر
ہم تو اپنے دِنوں کو رو بیٹھے

وہ نہ آیا تو کوئی بات نہیں
اُس کی باتیں ہیں کچھ کرو بیٹھے

مل کے بیٹھیں گے زیرِ سایہ کہیں
دل تو یک سُو ہو، گَرد تو بیٹھے

رَت جگے جن کی زندگی تھے نصیرؔ
شام ہی سے وہ لوگ، سو بیٹھے

1970ء

○

نہ سیرِ گُل نہ ہوائے ثمر میں آتے ہیں
وہ کیف و کم جو تری رہ گزر میں آتے ہیں

نہیں ہے صبر کا یارا تو دل گرفتہ نہ ہو
شکستگی کے یہ دن بھی سفر میں آتے ہیں

خزاں سے پہلے ہَوا کر گئی جنہیں بے شاخ
تمام رنگ وہ اب چشمِ تر میں آتے ہیں

وہ اپنی وضعِ طلب میں زمانہ ساز ہُوا
ہم ایسے لوگ کب اُس کی نظر میں آتے ہیں

رکھیں دِلوں کو سکوں آشنا جو ہنگامے
وہ ایک بار کہیں عمر بھر میں آتے ہیں

نہ جانے کون سی اُفتاد پڑ گئی ہم پر
مسافروں کی طرح اپنے گھر میں آتے ہیں

چراغ جلتے ہی کچھ بے چراغ اندیشے
کہاں کہاں سے دلِ بے خبر میں آتے ہیں

بہت زیاں کشِ موسم تھے ہم نصؔیر سو اب
شمارِ گُل نہ قطارِ شجر میں آتے ہیں

1974ء

○

اب صبح کوئی دَم ساز نہیں اب شام نہیں دل دَار کوئی
یا شہر کے رَستے بند ہوئے یا دل میں اُٹھی دیوار کوئی

وہ شہر نہیں وہ دَور نہیں وہ لوگ نہیں وہ طَور نہیں
سَر اپنا اُٹھا کر کون چلے، کیا سَر پہ رکھے دستار کوئی

اب کے تو صبا بھی تنگ آ کر اِس وادیٔ گُل سے لَوٹ گئی
سب نیند میں چلتے پھرتے ہیں کِس کِس کو کرے بیدار کوئی

شاموں کے جن سے ناتے تھے بے یاد کئے بھی آتے تھے
جب خیر خبر کی شب آئی، آیا نہ اِدھر غم خوار کوئی

اک خیمۂ حلقہ بگوشاں سے اک سرحدِ بابِ حریفاں تک
سب دُور کی باتیں کرتے ہیں، چلنے کو نہیں تیار کوئی

آواز کی جانب آنکھیں ہیں اِس سمت بہ سمت خموشی میں
چُپ چاپ گزرتا رہتا ہے، رفتار سے بے رفتار کوئی

اب راہ کے پیچ و خم بھی نہیں اب پہلے جیسے ہم بھی نہیں
سارے یہ دِلوں کے قصے ہیں پر دل ہی نہیں ہموار کوئی

نازاں تھے بہت تم لفظوں پر کیوں گُم ہو نصیرؔ اِس سوچ میں اب
لفظوں سے وَرا ہیں خواب یہاں، ہر خواب میں ہے آزار کوئی

1994ء

○

لوگ جب اپنی سُناتے ہوں گے
ہم تجھے یاد تو آتے ہوں گے

راستے ختم کہاں ہوتے ہیں
گھر سے آگے کہیں جاتے ہوں گے

کوئی بھی جب نہ ٹھہرتا ہوگا
بام و دَر شور مچاتے ہوں گے

گھنٹیاں دُور کہیں بجتی ہیں
قافلے ہم کو بُلاتے ہوں گے

جن کو جانا ہے چلے جائیں گے
جن کو آنا ہے وہ آتے ہوں گے

اب تو اِس شہر کے رہنے والے
دُوسرا شہر بساتے ہوں گے

خشک رہ کر بھی بیاباں اکثر
پیاس دریا کی بجھاتے ہوں گے

تُو ہی ہر سُو نہیں سایہ سایہ
کہیں ہم بھی نظر آتے ہوں گے

اِتنے مجبور نہیں ہیں ہم بھی
ہم تجھے بھول بھی جاتے ہوں گے

اُس سے مِل کر یہی وحشت ہے نصیرؔ
کیسے ہوں گے جو نبھاتے ہوں گے

1972ء

○

چلے تھے دل کے حوالے سے نام کرنے کو
مِلا نہ راہ میں کوئی سلام کرنے کو

ذرا یہ مرحلۂ سائباں گزر جائے
زمیں بہت ہے سفر میں قیام کرنے کو

میانِ دیدہ و دل معرکہ رہا ورنہ
یہ زندگی تو نہ تھی بے نیام کرنے کو

بیادِ موسمِ گُل جانبِ دَر و دیوار
ہَوا چلی ہے رقم تیرا نام کرنے کو

یہ اور بات سخن تجھ سے ہے بہت لیکن
ترس رہے ہیں تجھی سے کلام کرنے کو

دُھواں سا کچھ نظر آتا ہے اُس کنارے پر
کوئی چراغ اِدھر بھی ہو شام کرنے کو

زبانِ خلق تو کہنے کو کارگر ہے نصیرؔ
نگہ بھی کم نہیں قصہ تمام کرنے کو

1989ء

○

لذت کشِ آزار رہے میرؔ بھی ہم بھی
کس شوق سے بیمار رہے میرؔ بھی ہم بھی

ہاتھ آئی نہ ہو وہ زُلف کبھی جس کی لپک میں
اک عقدۂ دشوار رہے، میرؔ بھی ہم بھی

دِلّی سے بھی کچھ کم تو نہ تھا دل کا اُجڑنا
اک مکتبِ آزار رہے میرؔ بھی ہم بھی

نادار و زُبوں حال سہی عشق میں دونوں
یاروں کے مگر یار رہے میرؔ بھی ہم بھی

اَوروں نے بڑا نام کیا اُس کی گلی میں
لیکن پسِ دیوار رہے میر بھی ہم بھی

دن بھر تو کسی خواب سے آنکھیں نہیں کھولیں
رات آئی تو بیدار رہے میرؔ بھی ہم بھی

کیا باغ میں جاتے کہ نظر بھی نہیں آتے
صحرا میں نمودار رہے میرؔ بھی ہم بھی

ممکن نہیں پہنچے کوئی باتوں کو ہماری
تصویر بہ دیوار رہے میرؔ بھی ہم بھی

دربار سے نسبت ہے بڑی بات نصیرؔ
دربار سے بیزار رہے میرؔ بھی ہم بھی

1969ء

○

یادش بخیر، شام دلآویز ہے بہت
دل بھی تپاں ہے، آنکھ بھی لبریز ہے بہت

ایسا تو ہو کہ بزمِ طرب ماجرا نہ ہو
غم کے لیے نشاط بھی مہمیز ہے بہت

پیمانہ بیش و کم کا خمِ زُلف بھی تو ہے
ہم پر کھُلا کہ آج ہَوا تیز ہے بہت

احوالِ واقعیٔ کو تکلّم ہے کیا ضرور
اپنا سکوت ہی خبر آمیز ہے بہت

سَر پر ہے، اک پہاڑ سی تنہائیوں کی رات
اور شام سے چراغ کی لَو تیز ہے بہت

کیا ہم سے پوچھتے ہو شب و روزِ خیر گی
مدت ہوئی کہ شہر سے پرہیز ہے بہت

اب کیا سخن کا ذائقہ مذکور ہو نصیرؔ
کٹنے لگی زباں کہ نمک تیز ہے بہت

1979ء

○

ملنے کی طرح مجھ سے وہ پَل بھر نہیں ملتا
دل اُس سے ملا جس سے مقدر نہیں ملتا

یہ راہِ تمنا ہے یہاں دیکھ کے چلنا
اس راہ میں سَر ملتے ہیں، پتھر نہیں ملتا

ہم رنگیٔ موسم کے طلب گار نہ ہونا
سایہ بھی تو قامت کے برابر نہیں ملتا

کہنے کو غمِ ہجر بڑا دشمنِ جاں ہے
پَر دوست بھی اِس دوست سے بہتر نہیں ملتا

وحشت دَر و دیوار سے مانوس ہے اِتنی
صحرا کوئی اب شہر سے باہر نہیں ملتا

اے ہم سخنو کم سخنی ختم ہے اُس پر
یاں اُس کے سِوا کوئی سخن وَر نہیں ملتا

کچھ دن تو نصیرؔ آؤ، چلو گھر میں رہا جائے
لوگوں کو یہ شکوہ ہے کہ گھر پر نہیں ملتا

1971ء

○

تم شہر آشنا ہو تمھی یک دِلاں کہو
اب کون مہرباں ہے کسے مہرباں کہو

اب ویسے محرمانِ سخن بھی نہیں رہے
اب دل کی کوئی بات کہو تو کہاں کہو

جو شب کبھی نہ آئی تھی وہ شب بھی آگئی
شعلے کو اب چراغ کہو یا دُھواں کہو

کل ایسا رن پڑے گا قیامت کہ دیکھنا
کل یہ زمیں کہے گی "مجھے آسماں کہو"

پُرسانِ حال اگر وہ نہیں ہے تو ٹھیک ہے
کس نے کہا تھا تم سے یہاں کی وہاں کہو

آخر یہ احتسابِ تعلّق مجھی سے کیوں
لوگو کچھ اُس طرف کا بھی سُودوزیاں کہو

اُس زلفِ خَم بہ خَم کی پریشانیاں بجا
اُس چشمِ یم بہ یم کی پشیمانیاں کہو

یہ موسمِ قدح کی گُل اندازیاں دُرست
اُس لالہ پیرہن کی طرح دَاریاں کہو

ہر لمحہ کوئی طعنۂ دل دوز ہے نصیؔر
اور اُس کو چاہو اور اُسے جانِ جاں کہو

1978ء

○

میں نوشتۂ خزاں ہوں مِرے نام کچھ بہاراں
مِرے زخم سب ہَرے ہیں کوئی کارِ غنچہ کاراں

نہ تو اَبر سائباں تھا نہ کِرن ہی مہرباں تھی
میں وہ نخلِ سَرکشیدہ ہوں میانِ کوہساراں

وہ بہار تھی کہ تُو تھا یہ غبار ہے کہ میں ہوں
تُو سوادِ خوش چراغی، میں دیارِ بے دیاراں

کبھی رنگ رنگ تنہا کبھی موج موج باہم
کہیں دونوں صحنِ صحرا، کہیں دونوں بادو باراں

رہِ عشق میں ہیں اب تک وہی جاں کنی کے قصے
جو ہے بےقراریٔ جاں وہی جانِ بیقراراں

مراجی نہ چھوٹ جائے مری لے نہ ٹوٹ جائے
کوئی سازِ عہد سازی مرے نغمہ روزگاراں

کئی موسم آ کے مہکے کئی دور آ کے چہکے
نہ رواجِ شہر بدلا نہ سلوکِ شہر یاراں

کوئی ایک سلسلہ ہو تو میں اُس کو درج رکھوں
ہیں عجیب سرگذشتیں، پسِ گردِ شہسواراں

یہاں چاکِ پیرہن پر بڑی کج کُمانیاں ہیں
یہاں وصفِ صد ہُنر ہے، یہ لباسِ وضعداراں

گزر اے ہَوا اِدھر سے مگر اک ذرا سنبھل کے
یہاں شیشے سے بھی نازک ہے مزاجِ شیشہ کاراں

وہ ہو میرِ عشق تیشہ کہ نصیرِ میر پیشہ
یہاں راس ہی نہ آئی کوئی سعیٔ دل فگاراں

1982ء

○

بزم والو یہ بزم آرائی
تم ہی دیکھو، مجھے تو نیند آئی

ناگہاں چونک اُٹھا ہے سناٹا
دفعتاً بول اُٹھی ہے تنہائی

کوئی تو آئی آشنا آواز
دُور سے یا قریب سے آئی

بے سبب بھی ترا خیال آیا
بے ضرورت بھی آنکھ بھر آئی

میں جو آیا تو اُٹھ گئی محفل
اور کیا چاہیے پذیرائی

میرے ہونے سے ایک رونق تھی
اب کسے پوچھتی ہے رُسوائی

تیری باتیں ہیں میری خاموشی
تیری محفل ہے میری تنہائی

پہلے سنتے تھے اب ہُوا معلوم
گَرد خوشبو، سُکوت گویائی

پھر وہی روز روز جشن کوئی
پھر وہی شام شام تنہائی

کوئی افسونِ رقص ہے گویا
جسم ہے روح کا تماشائی

سنگ کے پیرہن میں رنگ ترنگ
زخم کی تہہ میں ہے مسیحائی

ایک پَرتو کمال جلوگیاں
ایک چہرہ ہزار رعنائی

ایک لمحہ محیط بر آفاق
ایک آنسو تمام بینائی

جُز خبر اور کیا ہے بے خبری
جُز گماں اور کیا ہے دانائی

یاں جو ناخوب ہے سو وہ خوبی
یاں جو کم زیب ہے سوزیبائی

شام ہوتے ہی یاں سے کوچ کرو
یاں چراغوں تلک ہے سچائی

گھر سے نکلو تو رِزق مِلتا ہے
ایک نعمت ہے آبلہ پائی

ناؤ کو ڈُوبنا ہی جب ٹھہرا
وہیں ڈُوبے جہاں ہو گہرائی

جانے والوں کا کچھ پتا نہ چلا
بیچ رستے سے آس لوٹ آئی

قُربتیں، فاصلے، چراغ، دُھواں
دُور بجنے لگی ہے شہنائی

1975ء

○

کیا بڑے لوگ ہیں یہ عشق کے مارے ہوئے لوگ
اپنے اِمروز میں فردا کو گزارے ہوئے لوگ

تجھ سے بے رُخ ہوئے جب آئینہ خانے تیرے
کام آئے ہیں یہی دل کے سنوارے ہوئے لوگ

سلسلے جوڑتے رہتے ہیں سخن کے کیا کیا
یہ تری چپ، ترے لہجے کے پکارے ہوئے لوگ

آج بھی کل کی طرح تیری طلب رکھتے ہیں
پیچ و خم دیدہ، کئی ہجر گزارے ہوئے لوگ

مُڑ کے اک بار اِدھر دیکھ تو اے وقت کی رَو
وہی اپنے تھے جو اب شہر کو پیارے ہوئے لوگ

تھم گیا شور مگر پوچھ رہی ہے یہ ہَوا
غرق دریا میں کہ دریا کے کنارے ہوئے لوگ

اِس طرف حلقۂ فریاد و فُغاں اور اُدھر
وہی مسند، وہی مسند سے اُتارے ہوئے لوگ

نہ ملی راہ میں ہمسائیگیٔ مہر تو کیا
اپنی ہی شعلگیٔ جاں میں ستارے ہوئے لوگ

اپنی آغوش میں رکھنا اِنہیں اے صبحِ کمال
اک قبیلے سے ہیں منسوب یہ ہارے ہوئے لوگ

کوہ کَن سا نہ ہُوا کوئی سرِ وادیٔ عشق
ویسے سَر دینے کو تیار تو سارے ہوئے لوگ

اک نصیرؔ اِس صفِ حیرت میں نہیں جانِ غزل
"شہر میں سب ترے جادو کے ہیں مارے ہوئے لوگ"[1]

1988ء

ا۔ عزیز حامد مدنی

کیا کہیں تم سے یہ آشفتہ طبیعت اپنی
جو کسی کے نہ ہوئے تھے وہ تمہارے ہوئے لوگ

○

اب کے ہے دَرخورِ جاں موسمِ جاناں کم کم
دل بھی کچھ کم ہے گراں چشم بھی گریاں کم کم

یاد آتا ہے دَر وبستِ فلک سے کیا کیا
کبھی ہم پر بھی کُھلا تھا درِ مژگاں کم کم

ملتے ملتے ہی ملا کوئی نہ ملنے والا
ہوتے ہوتے ہی ہُوا ہم سے گریزاں کم کم

ڈھلتے ڈھلتے ہی ڈھلا سائے میں سایہ کیسا
بجھتے بجھتے ہی بجھا شعلۂ ہجراں کم کم

آتے آتے ہی اِدھر آئے وہ آنے والے
سنتے سنتے ہی سُنا شورِ بہاراں کم کم

تجھ سے کیا کہتے جو گزری ترے مایوسوں پر
دل میں سَو وَسوسے، ظاہر میں پریشاں کم کم

کتنا دشوار ہے آگے کوئی وعدہ کرنا
ہم گلہ مند بہت اور تو پشیماں کم کم

جرعہ جرعہ ہوئی سیرابیٔ خاطر اِس بار
اور اَدا ہم سے ہُوا قرضِ گریباں کم کم

کچھ عجب کیف وکمِ جاں ہے نصیؔر اب کے برس
آمدِ شعر فزوں، آمدِ باراں کم کم

1976ء

○

دل اعتبار کی کوئی تو اِنتہا رکھے
اِس اِنتہا میں شکستوں کا حوصلہ رکھے

دل اپنا آ تو گیا بے چراغ رستوں پر
پلٹ کے گھر کو بھی جانے کا راستا رکھے

محبتوں کی بھی اک حد ہے احتیاط برت
کنارا جیسے کنارے سے فاصلہ رکھے

نہ جانے کون سے عالم میں ہوں کہ یہ دنیا
ملے تو مل کے بھی جی میں غبار سا رکھے

اب ایسے چاہنے والے کے انتظار میں ہوں
جو چاہتوں میں مِری طرح دل کھلا رکھے

میں ایک محرمِ آشفتگی مِرا کیا ہے
ترا سُلوک سلامت، تجھے خدا رکھے

کہو نصیؔر سے یہ دل کے مرحلے ہیں نصیؔر
کچھ اپنی حسرتیں کل کے لیے اُٹھا رکھے

1991ء

○

رہ گزر رہ گزر اے دلِ بے خبر وہ سماں اور تھا یہ سماں اور ہے
رُخ بدل کر بھی چل، کچھ سنبھل کر بھی چل، اب زمیں اور ہے آسماں اور ہے

مجھ سے رُودادِ رنگِ تحیّر سُنو مجھ سے احوالِ دَورِ تغیر سُنو
موسمِ رفتہ کیا فصلِ آیندہ کیا، اک خزاں جا چکی اک خزاں اور ہے

کوئی تو مژدۂ شادمانی ملے کچھ تو پروانۂ مہربانی ملے
میرے حصّے کی عمرِ رَواں اور ہے، اور اگر ہے، تو کتنی گراں اور ہے

دیکھتا ہوں کہ ہے خیمہ خیمہ دُھواں سوچتا ہوں گیا وہ قبیلہ کہاں
کل اِسی شام کا اور تھا ماجرا آج اِسی شام کی داستاں اور ہے

اعتبارِ طلوع و غروب اب کہاں دیکھنا خواب ہے سب زمان و مکاں
آنکھ کھولی تو تا دُور پرچھائیاں، آنکھ جھپکی تو سارا جہاں اور ہے

پیچ و تابِ طنابِ ہوا ہے وہی شورِ آشوبِ موجِ بلا ہے وہی
میری نقدِ ہنر میرا زادِ سفر، بس شکستہ سا اک بادباں اور ہے

رات آتی رہی رات جاتی رہی اپنی گردش کے قصے سُناتی رہی
تو ہوا صبح کی میں دِیا شام کا، کتنی راتوں کا غم درمیاں اور ہے

بے نوا کا کوئی ہم نوا بھی تو ہو کم سخن کا کوئی ہم سخن بھی تو ہو
اے نصیرؔ اک نوا ہے اُداسی تری، اِس اُداسی کا حسنِ بیاں اور ہے

1978ء

○

نکل چلو، مِرے ہم خواب و ہم نوا آگے
کوئی چراغ بہ رُخ مل ہی جائے گا آگے

ابھی تو گھر سے چلے تھے ابھی سے وحشت کیا
کچھ اِس سے بڑھ کے ہے گردش کا سامنا آگے

گزر بسر تو بہر حال ہو ہی جاتی ہے
جو حال اب ہے، یہی حال کب نہ تھا آگے

بڑے سلیقے تھے لوگوں کو کہنے سننے کے
سو آ گیا ہے خود اپنا کہا سُنا آگے

ہَوا زمانے کی اُلجھا گئی اُسے شاید
وہ تھا الگ مگر اِتنا الگ نہ تھا آگے

کہیں بھی جاؤ وہی سلسلے وہی قصّے
وہی پہاڑ سا ویران راستا آگے

بہت شریکِ غمِ راہ تھا سو یہ تعبیر
میں قافلے سے کہیں دُور، قافلہ آگے

ہَوس کے گھر کو نہ جاتا ہو راستا دل کا
کہ رَو ہے تیز بہت تیز، دیکھنا آگے

مِرا سفر عجب آشوب کا سفر ہے نصیؔر
وہ آئے جس میں ہو چلنے کا حوصلہ آگے

1978ء

○

شبِ ستارہ کُشا ہی مقدّروں میں نہ تھی
چراغ طاق پہ تھے روشنی گھروں میں نہ تھی

عجیب شہر یہ نکلا کہ وضعِ دل سوزی
قلندروں میں تو تھی بندہ پروروں میں نہ تھی

بہار اپنے ہی رنگوں میں سُرخرو گزری
وہ بے دلی تھی کہ آشفتگی سَروں میں نہ تھی

زمیں کا حال تو آوارگانِ راہ سے پوچھ
جو خشکیوں میں تھی گردش سمندروں میں نہ تھی

جواب دے گیا رقصِ پرندگاں آخر
کہاں تک اُڑتے کہ اب جان ہی پَروں میں نہ تھی

کبھی یہ وقت بھی گزرا کہ شام ہوتے ہی
وہ خامشی تھی گھروں میں جو مقبروں میں نہ تھی

نہ رنگِ مہر نہ کوئی خطِ شناسائی
دِلوں میں دیکھی وہ صورت جو پتھروں میں نہ تھی

چلی جو رسمِ وفا طالبانِ منصب میں
کبھی وہ تخت نشینوں کے چاکروں میں نہ تھی

سماعتوں کو میسّر تھی جس سلیقے سے
نوا کی کرب شناسی نواگروں میں نہ تھی

جو اک اشارۂ مژگاں میں تھی سخن رنگی
گُل و سمَن کے دلآویز دفتروں میں نہ تھی

یہ عہدِ عشق بھی دیکھا نصیؔر آنکھوں نے
نمِ مژہ میں تھی جو آب، خنجروں میں نہ تھی

1985ء

○

دل خانہ برانداز ہے، انداز تو دیکھو
اِس خاک کو آسودۂ پرواز تو دیکھو

کنعانِ رُخ و زُلف سے تانجدِ گریباں
اک قافلۂ دشمن و دم ساز تو دیکھو

شاید خبرِ موسمِ رفتہ کوئی مل جائے
کیا شہر رواں ہے، پسِ آواز تو دیکھو

یاں خاکِ تہہِ سنگ بھی تمہیدِ نمو ہے
یہ سلسلۂ خاکِ سراَفراز تو دیکھو

مُڑ کر کبھی دیکھو سفرِ عہدِ ملامت
انجام نہ دیکھو، چلو آغاز تو دیکھو

لوگو یہ صفِ گُل بھی کوئی گوشۂ جاں ہے
جا کر کبھی وہ کوچۂ طنّاز تو دیکھو

اُس یارِ طرح دَار کی باتوں پہ نہ جاؤ
لہجہ تو سُنو، چہرۂ غمّاز تو دیکھو

ہر غنچۂ خاطر ہے کہ مشتاقِ نوا ہے
اک سَروِ خموشی کا یہ اعجاز تو دیکھو

وہ چشمِ کم آمیز بھی کیا کم ہے، نصیرؔ
کچھ بھی نہ کہو، طرزِ سخن ساز تو دیکھو

1987ء

○

ہزار قُرب کے ہوتے بھی فاصلہ نہ گیا
نگاہِ شوق سے آگے تو نقشِ پا نہ گیا

محبتوں کے بہت دَر مسافروں پہ کُھلے
مگر جو گھر تھا اُسی گھر کو راستا نہ گیا

دیارِ گُل بھی عجب عرصۂ خرابی تھا
کہ قافلے کی طرح ایک قافلہ نہ گیا

ہَوا کو طائرِ بے آشیاں نے شاخ کیا
شکستہ رنگئ موسم سے حوصلہ نہ گیا

کچھ ایسا کم بھی نہ تھا ماجرائے شامِ فرق
بہت کہا تو بجز شُکر، کچھ کہا نہ گیا

نہ پوچھ کیا پئے تسکین جاں رہا باقی
یہ پوچھ دل زدگاں کی گِرہ سے کیا نہ گیا

وہ بستِ زُلف کہ تھی اپنی گردشوں کی شریک
بکھر کے رہ گئے ہم پھر بھی سلسلہ نہ گیا

تم اُس کے پاس بھی آ کر ہو خود سے دُور نصیرؔ
بہت قرار طلب تھے، قرار آ نہ گیا

1980ء

○

سایہ سکون ہوچکا، زُلف قرار ہوچکی
اپنی بس ایک شام تھی وہ بھی غبار ہوچکی

آنے سے پہلے اپنا دن اوَروں کے نام ہو چکا
ڈھلنے سے پہلے اپنی رات دُکھ میں شمار ہوچکی

اب ہیں کہاں وہ چھچھے دل جنھیں دلکشا کہے
رنگ اگر یہی رہے، پھر تو بہار ہوچکی

دل میں کوئی ہَری سی ہے شاخِ گماں ہَری سی ہے
اپنی تو حسرتِ بہار، گُل بکنار ہوچکی

یہ بھی ہے ایک زندگی یوں بھی سہی کبھی کبھی
اپنا تو بوجھ اُتر گیا، اپنی تو ہار ہوچکی

اب کسی اور گھر چلو اور کسی نگر چلو
سادہ رَوی و راستی شہر میں خوار ہوچکی

کَون دِلوں کے درمیاں پڑ کے فریق ہو یہاں
بات کہے بغیر بھی طے کئی بار ہوچکی

بزم کو کچھ خبر نہیں یاں تو ذرا سی دیر میں
آنکھ ادائے یار پر شُکر گزار ہوچکی

ایسا بھی کیا زیاں ہے اب اِتنی طلب بھی کیا طلب
منّتِ یار ہوچکی، اے دلِ زار ہوچکی

ہم سے فقیر بھی کہاں، ہم سے نصیرؔ بھی کہاں
جس پہ ہوئی نثار جاں، اُس پہ نثار ہوچکی

1993ء

○

گشت کرتی ہے ہَوا کوئی یہاں ہے کہ نہیں
کسی حلقے کسی پردے میں فغاں ہے کہ نہیں

خوش نُمائی دَر و بام سے خوش مت ہونا
یہ مکاں دیکھنا اندر سے مکاں ہے کہ نہیں

دیکھنا چہرہ تو پھر دیکھنا چہرہ اک بار
کوئی رنج اور کوئی اور گماں ہے کہ نہیں

کچھ تو معلوم ہو آخر مِرے حق میں کیا ہے
وہ نہیں ہے کہ نہیں، اور وہ ہاں ہے کہ نہیں

چشمِ تر میں نہ رہی بات وہ پہلے جیسی
اے غمِ جاں یہ زیاں دل کا زیاں ہے کہ نہیں

احتیاطوں کو بری کوئی نہ سمجھے شاید
تم کہو میری روش تم کو گراں ہے کہ نہیں

ایسا ہموار نہیں کوچۂ سودائی نصیرؔ
چل تو نکلے ہو، طبیعت بھی رواں ہے کہ نہیں

1990ء

○

کہنا ہے اگر کچھ تو بہرحال کہے نا
اب تک جو گرہ دل میں پڑی ہے وہ کُھلے نا

اندوہِ مسافت سے وہ آگاہ بہت ہے
ایسا ہے تو کچھ دُور مِرے ساتھ چلے نا

چلنا ہے تو دنیا کی طرف میری طرح چل
ہر گام گماں ہو کہ زمیں پاؤں تلے نا

ہر دن کوئی دیوار اُٹھانے میں گزر جائے
ہر شام یہ اندیشہ کہ دیوار گرے نا

اس دل کی عجب لو ہے کہ دھیمی نہیں پڑتی
اور یہ بھی کہ اک بار بجھے دل، تو جلے نا

یا روز ملاقات تھی یا اب یہ روش ہے
میں آؤں کہ نا آؤں، ششش و پنج اُسے نا

رہنے دو مجھی تک مِرے احوال کو لوگو
تم ایسی اذیت اُسے پہنچاؤ، ارے نا

اب شہر کے آثار کچھ اچھے نہیں ایسے
ایسا نہ پڑے رن کوئی سایہ ہی بچے نا

یوں سلسلۂ بزم ہو پھر آج نصیرؔم
تھم جائے اُدھر ساز، اِدھر دل کہ تھمے نا

1994ء

○

یہ رکھ رکھاؤ یہ برتاؤ یہ سُپردگیاں
تجھی پہ ختم ہیں تیرے ہدف کی طُرفگیاں

ابھی کچھ اور زمانہ ہمارے ساتھ گزار
ابھی عیاں نہیں تجھ پر ہماری سادگیاں

کسے یہ غور کی مہلت بھی دی سخن نے ترے
سمجھنے والے ہی سمجھے تری فسردگیاں

ہمی سے پوچھ کچھ اندازِ چشم و لب اپنے
کسی کی بات میں اور تیری چپ میں نغمگیاں

ہَوائے سَرد سے بے بس ہوئی ہے آتشِ گل
مگر وہی ہیں ترے پیرہن کی شعلگیاں

نہ رنگ بیزیاں گُل میں تری قبا کی سی
نہ سَرو میں ترے قد کی سی خوش دَمید گیاں

ترا سکوت بھی گویا کہ ہے کوئی تصویر
لب و نگاہ میں یک رنگ نرم لہجگیاں

یکایک آج ہَوا خوش نفس ہوئی کیا کیا
کہ لوگ بُھول چلے ہیں تمام خستگیاں

کوئی بھی آنکھ نمِ خواب سے نہیں خالی
گزر رہی ہیں سفر ہی سفر میں زندگیاں

ہمیں تو راہ گزر ہیں ہمارے شعلے بھی
ہمیں تو گھر کی طرح ہیں ہماری تیرگیاں

کیا سلوک نے تیرے غزل غزل سیراب
اور اب بھی قرض ہیں تجھ پر ہماری تشنگیاں

بہت دِنوں سے عجب حال ہو گیا ہے نصیرؔ
نہ اب وہ دوستیاں ہیں نہ وہ کشیدگیاں

1988ء

یاں حال سے میں بے حال ہُوا کوئی دیکھنے والا ہے کہ نہیں
وہ پوچھنے والا بھول گیا، کوئی دیکھنے والا ہے کہ نہیں

دن بھر تو شہرِ دل زدگاں اک شہرِ خموشاں رہتا ہے
راتوں کو مگر آتی ہے صدا، کوئی دیکھنے والا ہے کہ نہیں

اک عرصۂ آتش زیرِ قدم اور سَر پہ نزولِ بارشِ غم
اے میرے خدایاں تیرے سِوا، کوئی دیکھنے والا ہے کہ نہیں

کس عہد سے رشتہ جوڑ گیا مجھے آج اور کل پر چھوڑ گیا
تُو بھی تو آ کر دیکھ ذرا، کوئی دیکھنے والا ہے کہ نہیں

کیا جشن ہے جشنِ تنہائی احوال کے صورت خانے میں
کچھ میری طرف بھی مجھ سے جُدا، کوئی دیکھنے والا ہے کہ نہیں

اک بام دھنک، اک شاخ چمک، اک خواب فضا اور دُور تلک
سَرگوشی کرتا سناٹا، کوئی دیکھنے والا ہے کہ نہیں

اک مدّھم سُرخی لرزاں سی اک کم کم سایہ گرداں سا
یہ چہرہ چراغ یہ زلف ہَوا، کوئی دیکھنے والا ہے کہ نہیں

یہ آنکھ کہے وہ آنکھ سُنے اِس دُکھ کو نصؔیر اب کون لکھے
کہاں رنگ کھلا کہاں رنگ بجھا، کوئی دیکھنے والا ہے کہ نہیں

1993ء

○

ایک نگاہِ مہرباں سارے ملال لے گئی
مژدۂ تازہ کیا دیا، ماضی و حال لے گئی

کب تھا مجھے دماغِ عیش وہ تو کہو کہ ناگہاں
حلقۂ رفتہ کی طرف صورتِ حال لے گئی

گفت و شنید باہمی پہنچی جو تا بہ ہمدمی
پھر تو ہوائے بے خیال، کتنے خیال لے گئی

وہ بھی تھی اک شبِ اُمید دے کے مجھے چراغِ دید
عمرِ ہزار خواب کے سب مہ و سال لے گئی

کیسے بیک نفس ملے دیدہ و دل کے سلسلے
غم ہی کی ایک رَو تھی جو غم سے نکال لے گئی

طُرفہ رَویٔ وقت بھی کیسی بہانہ جُو رہی
رسمِ وصال کیا کہ وہ یادِ وصال لے گئی

کچھ نہ کُھلا دمِ وداع، بزم میں چشمِ خوش ہدف
کس کو بِچھا گئی کہاں کس کو سنبھال لے گئی

یہ جو ہے خُوں بہ آستیں خاکِ زمیں کہیں کہیں
قصۂ خونِ خلق کی تجھ سے مثال لے گئی

موسمِ دل کی پہلی شام یاد نہیں نصیؔر کیا
پھول کِھلا کے راہ میں، سب پَر و بال لے گئی

1992ء

○

بارے سخن کی سیر کے آزار دیکھیو
گُل دیکھیو تو زخم نمودار دیکھیو

اک سیلِ وقت ہے کہ ٹھہرتا نہیں کہیں
ہر آن قافلہ سا ہے تیار دیکھیو

میں مثلِ برگِ زرد کنارِ صبا میں ہوں
کیسی فضا ہے یہ برِ گُل زار دیکھیو

پست و بلندِ راہ، سبھی ہیں مجھی تلک
مجھ سے گزر کے راہ کو ہموار دیکھیو

چنداں رہا نہ فاصلہ دونوں کے درمیاں
حائل مگر ہے حرف کی دیوار دیکھیو

تا حال اُس کے عشق کی رونق فزوں نہیں
شاید کچھ اور ہجر ہے درکار دیکھیو

مجھ کو دمِ غیاب بھی موجود جانیو
میری کمی کو بزم میں بسیار دیکھیو

دریوزگانِ کوچۂ شہرت کہو کہو
میں نے کہا نہ تھا مجھے بیزار دیکھیو

اے خلوتِ خیال کی آوازِ نارسا
ہوتا ہے کون گوش بہ دیوار دیکھیو

اب دل ہے اور عرصۂ گہہ کج دِلاں نصیؔر
اِس بے سپر کی چال سے ہُشیار، دیکھیو

1999ء

○

اب ایک عمر گزاری ہے تب ہُوا معلوم
یہی کہ جو ابھی معلوم وہ بھی نامعلوم

سب اپنے اپنے ہجومِ خیال میں گُزراں
یہاں کسی کو کسی کا نہیں پتا معلوم

کوئی ہَوائے گماں تھی کہ اتفاقِ طلب
گھروں سے چل پڑے اور کچھ نہیں کیا معلوم

عجب نہیں کوئی تدبیر کارگر ہو جائے
بس اک تسلیٔ خاطر ہے، فیصلہ معلوم

یہ کیسی لذّتِ جاں ہے یہ کیوں ہے وحشتِ دل
ہمیں کو عِلم نہیں دوسروں کو کیا معلوم

کسی مجازِ مخاطب کا محرمانہ سخن
ترے فراق میں ہوتا ہے کیوں بُرا معلوم

گئے دِنوں کی حکایت بھی کُھل گئی آخر
اور آنے والے دِنوں کا بھی سلسلہ معلوم

نہ آیا نوکِ مژہ پر کبھی بھی حرفِ ملال
شکستِ دل کا مگر اُن کو ماجرا معلوم

دِلوں کی راہ یہاں تک تو خیر سے گزری
اب اِس کے بعد گزرنی ہے کیا، خدا معلوم

ابھی نگاہِ توجّہ اِدھر نہیں ورنہ
وہ دیکھ لے تو ہو چہرہ بھی آئینہ معلوم

تو اپنے کُنج میں یوں مطمئن نہ بیٹھ نصیؔر
نکل کے شہر کی حالت بھی کر ذرا معلوم

1992ء

○

کہاں وہ شہر کی شامیں شکستہ حالوں میں
چراغ جلتے ہی باتیں کریں خیالوں میں

یہ دل ہے یا کوئی افسوس کی صُراحی ہے
یہ چشم ولب ہیں کہ حسرت بھری ہے پیالوں میں

ہوائے دشتِ خُتن دل کو کھینچ رکھتی تھی
رمیدگی بھی صفت تھی کبھی غزالوں میں

بساطِ سبزہ و گُل سے ہُوا اب اندازہ
کہ یہ زمیں تھی کبھی اپنے اعتدالوں میں

یہ زندگی تھی بہت خُوگر نمود سو اب
پروئے وقت نے چاندی کے تار بالوں میں

ہرے بھرے کسی موسم کی بازیابی کو
رکھیں ہیں زخم ہی زخموں کے اِندمالوں میں

وہ شے کچھ اور ہے وجہِ شگفتِ جاں لیکن
بدن بھی خوب وسیلہ رہا وصالوں میں

مگر کہاں تلک آسودگی کشید کریں
ترے ملال کا نشّہ سبھی مِلالوں میں

نہ ذکرِ فصلِ گزشتہ نہ فرصتِ گریہ
رہا نہ ہجر کا قصہ ہی ہجر والوں میں

○

کہاں وہ شہر کی شامیں شکستہ حالوں میں
چراغ جلتے ہی باتیں کریں خیالوں میں

یہ دل ہے یا کوئی افسوس کی صُراحی ہے
یہ چشم ولب ہیں کہ حسرت بھری ہے پیالوں میں

ہوائے دشتِ خُتن دل کو کھینچ رکھتی تھی
رمیدگی بھی صفت تھی کبھی غزالوں میں

بساطِ سبزہ و گُل سے ہُوا اب اندازہ
کہ یہ زمیں تھی کبھی اپنے اعتدالوں میں

یہ زندگی تھی بہت خُوگر نمود سو اب
پروئے وقت نے چاندی کے تار بالوں میں

ہرے بھرے کسی موسم کی بازیابی کو
رکھیں ہیں زخم ہی زخموں کے اِندمالوں میں

وہ شے کچھ اور ہے وجہِ شگفتِ جاں لیکن
بدن بھی خوب وسیلہ رہا وصالوں میں

مگر کہاں تلک آسودگی کشید کریں
ترے ملال کا نشّہ سبھی مِلالوں میں

نہ ذکرِ فصلِ گزشتہ نہ فرصتِ گریہ
رہا نہ ہجر کا قصہ ہی ہجر والوں میں

ہم اپنی وضع کی تنہائی سے شمار میں ہیں
ہمیں شریک نہ کر دوسرے حوالوں میں

بس ایک آخری امکان تھا کہ ختم ہوا
سو بے حسی بھی نہیں رنج کے اِزالوں میں

وہ کون ہے جسے تشویشِ دارو گیر نہیں
تمام شہر ہی گویا ہے یرغمالوں میں

یہ اور بات زمانوں میں پیش و پس ہے نصیرؔ
زیادہ دیر کا وقفہ نہیں زوالوں میں

1991ء

○

کچھ اُس کی کم سُخنی پر بھی حرف آجاتا
میں بولتا تو مجھی کو بُرا کہا جاتا

جو عکس کو نگہِ محرمانہ چھُو جاتی
تو اُس کے ہاتھ سے خود اُس کا آئینہ جاتا

میں اُس گلی سے نہ گزرا چلو یہ خیر ہوئی
اُدھر میں جاتا تو کیا کیا نہ سوچتا جاتا

کہاں تھے ویسے بھی کم روز و شب کے ہنگامے
سب آتے جاتے رہے، کاش وہ بھی آجاتا

کہیں بھی دل کو لگاؤں، اُسی کے سائے میں ہوں
گماں سے جو نہ گیا وہ یقیں سے کیا جاتا

حسابِ رنج و طرب درمیاں میں کیا رکھنا
دِلوں کے کام میں سَودا نہیں کیا جاتا

میں اپنے آپ میں رہنے کے طَور کرتا ہوں
زیادہ دیر کہیں بھی نہیں رہا جاتا

چلا ہوں میں ہی نہ چلنے کے مَرحلوں کی طرف
اب اِس سفر پہ ہے کب کوئی دوسرا جاتا

رہِ خرد میں اک ایسا بھی ہے گروہِ جنوں
جو ساتھ چلتا تو کتنا مجھے تھکا جاتا

میں وہ سفینۂ آزادہ رَو نہیں کہ مجھے
ڈُبوتی جاتی ہوس اور میں ڈُوبتا جاتا

ہمیشہ پیاس کو دریا پہ جانا پڑتا ہے
صدا لگانے سے دریا کہاں ہے آجاتا

نصیؔر فیصلہ ہوگا، کچھ انتظار کرو
کہ رائگاں تو نہیں دل کا سلسلہ جاتا

1998ء

○

دل نہ کرو یوں بُرا وقت گزر جائے گا
وقت گزرتا رہا وقت گزر جائے گا

پہنچے گا خیلِ گماں جبلِ یقیں تک کہاں
دل شدگاں دیکھنا، وقت گزر جائے گا

بادِ صبا شاخ کو تکتے ہی رہ جائے گی
جب بھی درِ گُل کھُلا، وقت گزر جائے گا

کل بھی رہے گا تپاک کل بھی اُڑے گی یہ خاک
رقص کرے گی ہَوا، وقت گزر جائے گا

کوئی نوا ہم نوا ہوگی نہ گوش آشنا
بے جرس و بے صدا وقت گزر جائے گا

وقت کے بارے میں لوگ سوچتے رہ جائیں گے
گرم دم و تیز پا وقت گزر جائے گا

جس کا ہے یوں اضطراب ہوگا وہ دن بھی خراب
کچھ بھی نہ ہوگا پتا وقت گزر جائے گا

خواب بکھر جائیں گے یاد ٹھہر جائے گی
اور بس اِلتوا وقت گزر جائے گا

عمرِ رواں قافلہ مُڑ کے نہیں دیکھتا
آنکھ لگے گی ذرا وقت گزر جائے گا

گردشِ لیل و نہار کرتی ہے کب انتظار
اے مِرے صبر آزما، وقت گزر جائے گا

وقت کہیں جستجو وقت کہیں آرزو
وقت مگر بے وفا، وقت گزر جائے گا

یوں جو رہو گے نصیرؔ خلوتی و گوشہ گیر
سوچ لو یہ آشنا وقت گزر جائے گا

1999ء

آہِ شرر ریزے

زان بیش ندانیم نصیؔر از ہمہ رنگی
رنگیست چو رویائے کم آزار و دِگر ہیچ

*

درباره آمدی اے غم، خوش آمدی لیکن
بگو، ز خانۂ آشوبِ دل چہ می خواہی

*

ہر رخنۂ دیوار دہانیست کہ گویا
پنہان بہ درونش ہمہ احوال برون است

*

نیست این لالہ خونین کفن اے بی خبران
خاکِ مدفونِ خزان شعلہ وَش آوردہ برون

*

سوئے بُستانِ دِلم سَروِخوش انداز بیا
ہمہ رُخ چشم براہِ تو بود باز بیا

*

بُرون از تنگنائے قُرب و بُعدِ یار می رقصم
گریبان چاک و پابستہ سرِ بازار می رقصم

سر بسر زلفِ تو گر حلقہ پیچان دارد
این ہمہ سلسلہ، خوش کامیٔ امکان دارد

*

خوشا زمانۂ گردان و یادِ ایاّمے
غمِ فراقِ صنم ہرچہ بود، راحت بود

*

شادم کہ بہ تقریبِ یقین منزلتی ہست
غم نیست اگر نزدِ گمان رُوئے ندارم

*

راحلہ چیست درین مرحلۂ عشق نصیؔر
راہ چندان کہ سپاریم بہ منزل نرسد

*

نگارم صد شمائل بود شب جائیکه من بودم
دِلم خود فرشِ محفل بودشب جائیکه من بودم

درونِ حلقهٔ یادش که سیرگاهِ دل است
غبارِ کوئے خلل را گزر نخواهد بود

*

میانِ هردو، به هجرِ تو صحبتے دارم
دلِ دریده یکی، چشمِ اشکبار یکی

*

تمامِ شهر گرفتار و درپیٔ آزار
درین فضا به مقامت ز قبلِ شام بیا

*

منم آن نهالِ خوبی که به این شکسته حالی
به تلاشِ سایه هر کس به کنارِ من بیاید

*

طرفه رُوئی که منِ بے سَروپا را همه شب
خواب ناکردن و صد خوابِ رسائی دیدن

*

درمیانِ من و اُو رسمِ سخن جائے نداشت
چشم با چشم به صد شیوه سخن می گوید

*

گاہے نگاه می کند و گہ نمی کند
دیدی چه طور یارِ من آمد بکارِ من؟

*

شادم از وصل و نگیرم که چه جانان دارم
نالم از ہجر و ندانم که چه ہجران دارم

*

درونِ آئینه حالت دِگر شود جانان
چنان به صورتِ من سُوئے خود نگاه کنی

*

ز کج بیانیٔ چندین و بے رخیٔ یکی
جُدا شدیم ز بزمش و دل شکسته شدیم

*

یک خاک بسر گفت سرِ دشت که یاران
بے گاه رسیدند و سواران همه رفتند

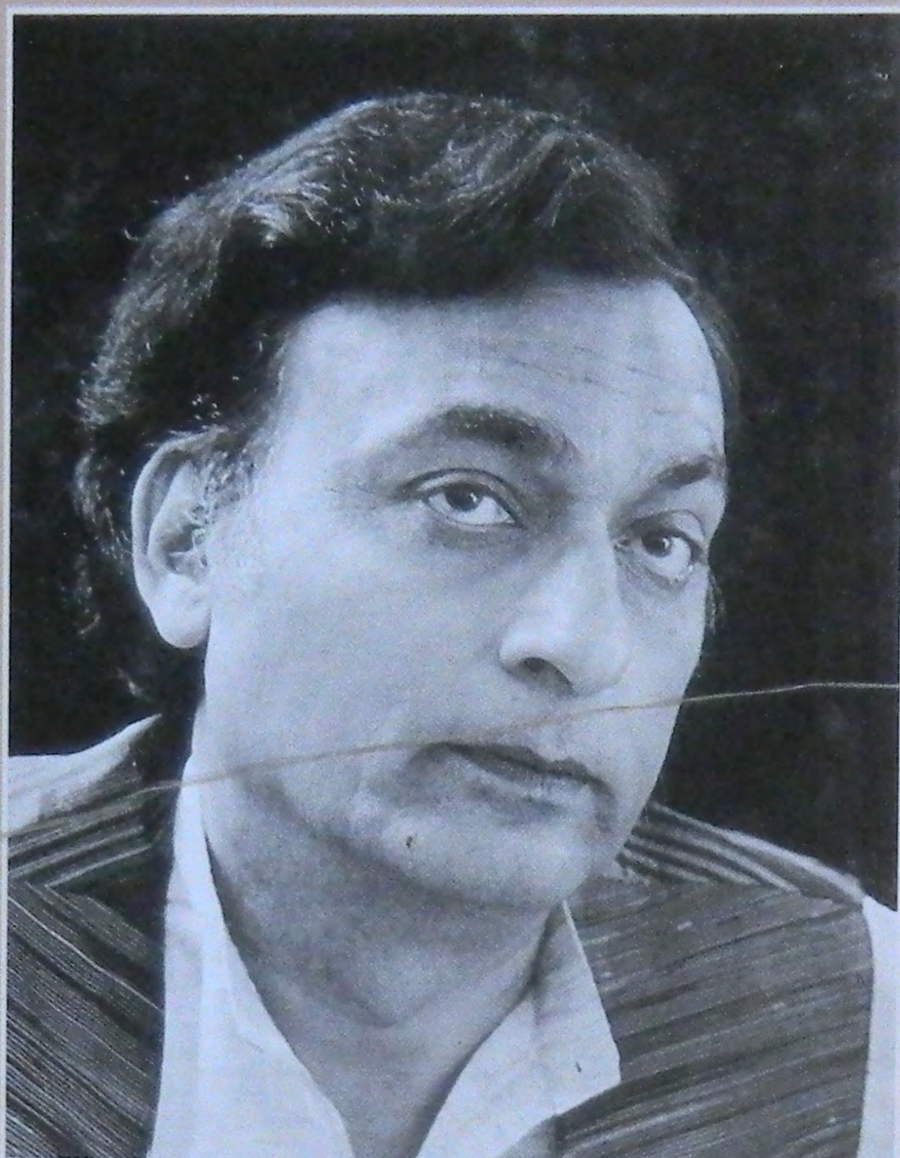
افسوس که افسوس گُزاران نه رسیدن
فریاد که فریاد گُساران همه رفتند

اُفتاد که اُفتاد شناسان نمی پرسند
آزار که آزار شعاران همه رفتند

دردا که بجز کارِ فغان کار نداریم
آں قافلۂ زمزمه کاران همه رفتند

ایک شعر ماہرؔہ کے لیے

قصۂ عمرِ من اے محرمِ جان نیست دِگر
عمر می خواہم اگر، بہرِ شُما می خواہم



ابھی نگاہِ توجّہ اِدھر نہیں ورنہ
وہ دیکھ لے تو ہو چہرہ بھی آئینہ معلوم